بزم تحقیق کا نجم الثاقب

ڈاکٹر نجم الاسلام

(م: ۲۰۰۱ء)

ڈاکٹر نجم الاسلام مرحوم ان گنے چنے لوگوں میں سے تھے جنہیں پاکستان میں تحقیق کی آبرو کہا جاسکتا ہے۔ وہ ہجرت کے بعد سکھر اور حیدر آباد میں رہے، اس لیے ہمارے درمیان تعارف کی نوبت بہت دیر میں آئی اور یہ تعارف بھی غائبانہ ہی رہا۔ سچ پوچھیے تو مجھے ان کی علمی وقعت کا اندازہ سنہ ۱۹۸۷ء میں شائع ہونے والے رسالہ "تحقیق" کے پہلے شمارے سے ہوا(۱)، لیکن افسوس اس بات کا ہے کہ جب ان کے ساتھ مخلصانہ تعلقات مستحکم ہوئے تو وہ اچانک سفر آخرت پر روانہ ہوگئے:

خوش درخشید ولے دولت مستعجل بود

اندریں حالات، مرحوم پر صحیح معنی میں کوئی مضمون لکھنے کی صلاحیت میں اپنے اندر نہیں پاتا کیوں کہ اس کے لیے جس قربت کی ضرورت ہوتی ہے، وہ مجھے میسر نہیں آسکی، لہٰذا یہ سطور میرے نام ان کے مکاتیب کی روشنی میں سپرد قلم کی جارہی ہیں اور انہیں ان خطوط کا تعارف بھی کہا جاسکتا ہے۔

فروری ۱۹۹۰ء میں غالب انسٹی ٹیوٹ، نئی دہلی کے زیر اہتمام منعقد ہونے والے حافظ محمود شیرانی سیمینار میں میرا جانا ہوا۔ وہاں محترم ڈاکٹر نذیر احمد نے میرے توسط سے کچھ کتابیں اور دستاویزات پاکستان کے بعض اہل علم کو بھیجیں۔ ان میں ڈاکٹر مختار الدین احمد کی علی گڑھ سے

ارسال کردہ دو مخطوطات کی عکسی نقلیں بھی تھیں۔ اس وقت تک میں نے ''تحقیق'' کے تین شماروں سے ڈاکٹر نجم الاسلام کے بارے میں جو رائے قائم کی تھی، اس پر ان دو محترم شخصیات کے اقدام سے مہر تصدیق ثبت ہو گئی۔

حضرت غوث علی شاہ قلندر نے حج پر جاتے ہوئے سمندری جہاز کے ایک عمر رسیدہ ملاح سے پوچھا کہ تمہیں جہاز پر کام کرتے عمر گزر گئی، کبھی کسی مرد خدا سے بھی ملاقات ہوئی؟ اس نے جواب دیا: جی ہاں! اس عرصے میں دو با خدا شخص میں نے دیکھے ہیں: ایک تو برسوں پہلے دیکھے تھے اور دوسرے آج آپ کو دیکھا ہے۔ شاہ صاحب نے استفسار کیا: میرے بارے میں تم یہ بات کس بنیاد پر کہہ رہے ہو؟ ملاح بولا: آج تک آپ کے سوا کسی نے یہ سوال مجھ سے نہیں پوچھا، اس سے میں نے اندازہ لگا لیا، کیوں کہ ایک مرد خدا ہی دوسرے مرد خدا کی ٹوہ میں رہتا ہے اور اس سے رابطے کا خواہاں ہوتا ہے۔

دہلی سے واپس آ کر میں نے دونوں مخطوطات کے عکس ایک عریضے کے ساتھ حیدر آباد روانہ کر دیئے۔ اس وقت تک اشاعت پانے والے ''تحقیق'' کے تینوں شمارے میں نے لائبریری میں دیکھے تھے۔ اب موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے میں نے یہ پرچے قیمتاً ارسال کرنے کی درخواست کی اور اپنے مکرم ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خان صاحب کی خدمت میں سلام پہنچایا۔

کتابوں کی رسید کی اطلاع مرحوم نے اپنے ۲۴ مارچ ۱۹۹۰ء کے مکتوب سے دی جو میرے نام ان کا پہلا خط تھا۔ اس مختصر سے خط کو بغور دیکھنے سے ان کی سیرت کے بعض پہلو نمایاں ہوتے ہیں۔ ایک تو ان کا حسن اخلاق جس کا اندازہ ان کی بے ساختہ ممنونیت سے ہوتا ہے۔ دوسرے ''تحقیق'' کو خوب تر بنانے کی لگن کا آئینہ دار یہ فقرہ کہ '' آپ کا یہ عملی تعاون چوتھا شمارہ بہتر طور پر نکالنے میں مددگار ہوگا'' اور تیسرے ان کا مجھ ہیچ کارہ کے ساتھ یہ حسن سلوک کہ آیندہ شائع ہونے والے شمارے مجھے اعزازی طور پر عطا کئے جائیں گے۔

ڈاکٹر صاحب کی مہربانی سے متاثر ہو کر میں نے ایک مضمون بعنوان ''محمود شیرانی کا

تحقیقی طریق کار" ان کی خدمت میں ارسال کیا جس کی رسید انہوں نے ۲۴ اپریل ۱۹۹۰ء کے خط میں دی۔ یہ مضمون پانچویں شمارے (۱۹۹۱ء) میں چھپا۔ اس کے حواشی کے نمبر شمار کی طباعت میں کچھ گڑ بڑ ہو گئی تھی جس کا اظہار انہوں نے ۲۵ مارچ ۱۹۹۲ء والے خط میں کیا ہے۔ میں نے "تذکرہ مخزن الغرائب وانیس العاشقین کے موضوع پر ہونے والی ادبی معرکہ آرائی کی روداد لکھنے کی پیشکش کی تھی جس میں انہوں نے دلچسپی کا اظہار کیا۔ چنانچہ یہ مضمون مکمل کر کے ان کی خدمت میں روانہ کر دیا گیا تاہم انہی دنوں ڈاکٹر صاحب پر یرقان کا سخت حملہ ہوا۔ اس ضمن میں وہ حیدر آباد اور کراچی میں زیر علاج رہے۔ اس علالت کے باعث شمارہ نمبر ۶، جسے ۱۹۹۲ء میں نکلنا تھا، مارچ ۱۹۹۳ء میں شائع ہو سکا۔ میرے مضمون کی اشاعت کے بارے میں اطلاع انہوں نے ۴ مارچ ۱۹۹۳ء کے نوشتہ سے دی۔ یہ شمارہ مجھے مئی ۱۹۹۳ء میں موصول ہوا۔

۱۰ جون ۱۹۹۳ء کے خط میں فرہنگ نامہ قواس کے بارے میں کچھ استفسار کئے گئے تھے۔ علاوہ ازیں میری درخواست پر ڈاکٹر سخی احمد ہاشمی مرحوم کا کراچی کا پتہ تحریر کیا تھا۔ ہاشمی صاحب میرے مقالے کے ممتحن تھے۔ جب وہ زبانی امتحان لینے لاہور تشریف لائے تو میری ان سے پہلی اور آخری ملاقات ہوئی اور میں ان کی سادہ اور پرکار شخصیت کا گرویدہ ہو گیا۔ جون ۱۹۹۳ء میں میرے مقالے کی پہلی جلد شائع ہوئی تھی جو میں ہاشمی صاحب کو پیش کرنا چاہتا تھا۔ تازہ پتہ اسی لئے درکار تھا۔

ڈاکٹر نجم الاسلام تحقیقی سرگرمی میں اعلیٰ معیار اور اخذ کردہ نتائج کے اظہار میں حد درجہ توازن اور احتیاط کے قائل تھے۔ اسی طرح تحقیقی مضامین کی زبان میں ذرا سی سختی یا لہجے میں ذرا سا کھردراپن بھی ان سے برداشت نہ ہوتا تھا۔ یہ بات ان کی مہذب اور مرنجاں مرنج شخصیت کے عین مطابق تھی۔ مجھے بھی ان کی سیرت کے اس پہلو کا تجربہ ہوا۔ وہ یوں کہ جب میں نے اپنے مقالے کی پہلی جلد ان کی خدمت میں ارسال کی تو انہوں نے اس پر تبصرہ لکھا جو "تحقیق" کے ساتویں شمارے (بابت ۱۹۹۳ء) میں چھپا۔ اس تبصرے میں انہوں نے مقالے کی تعریف کے

ساتھ ساتھ اس کی جن خامیوں کا تذکرہ کیا ان میں سب سے بڑا اعتراض یہی تھا۔ وہ لکھتے ہیں:

> ''باب دوم...... میں ...... شیرانی کی پنجاب میں اردو کی پرزور مدافعت ہے اور نا قدین کا رد بھی مگر اس قسم کے گرم فقروں کے ساتھ جو نہ ہوتے تو اچھا تھا۔ ایسے فقرے تحقیق کو وکالت کی حد میں لے آتے ہیں۔ پھر یہاں تو معاملہ پہلے ہی نازک ہے کہ ایک پوتے نے دادا پر تحقیق کی ہے۔ جامعاتی تحقیق کی تاریخ میں ایسا پہلے کب ہوا ہے؟''

اصولی طور پر ڈاکٹر صاحب کی بات درست تھی لیکن نظریہ پنجاب میں اردو پر بحث کرتے ہوئے بعض ناقدین نے جس طرح کے غیر منطقی اور تاریخی و جغرافیائی اعتبار سے بے سر و پا مفروضات پیش کئے ہیں اور ضمناً جن حماقت آمیز چالاکیوں سے کام لیا ہے ان کی تغلیط و تردید کا فریضہ طنز کے نشتر کے بغیر ادا ہو ہی نہیں سکتا تھا اور یہ کام میں نے جذبات سے مغلوب ہو کر نہیں، انتہائی مجبور ہو کر کیا تھا۔

بہر حال ڈاکٹر صاحب کی کریم النفسی دیکھئے کہ محولہ تبصرے میں اپنی اختلافی آراء پر جن کے اظہار کا انہیں پورا حق حاصل تھا، اپنے ۵ ستمبر ۱۹۹۵ء کے گرامی نامے میں یوں اظہار معذرت کرتے ہیں:

> ''فی الحقیقت یہ کتاب آپ نے بڑی محنت اور عمدگی سے لکھی ہے۔ اس کی تحسین میں تبصرے میں کر چکا ہوں اور یہ خط لکھ کر بھی کرتا ہوں۔ چند ایک امور جو قابل توجہ نظر آئے، اپنی سمجھ کے مطابق تبصرے میں ان کا مخلصانہ اظہار بھی کر دیا ہے۔ ملتمس ہوں کہ آپ از راہ کرم ان گزارشات کا کچھ خیال نہ فرمائیں۔ میں حسب سابق آپ سے مشفقانہ برتاؤ کی توقع رکھتا ہوں اور رسالہ تحقیق کے لئے آپ کے گراں قدر تعاون کا طلب گار ہوں۔''

اس شرافت کے ساتھ ساتھ ان کی وسیع القلبی ملاحظہ ہو کہ آگے چل کر انہوں نے

میرے مقالے کی اسی جلد پر الیاس عشقی صاحب کا ایک تبصرہ نما مضمون ''تحقیق'' (شمارہ ۱۲۔۱۳) میں شامل کیا جس میں مرحوم کے اپنے متذکرہ بالا اعتراض کی ایک طرح سے تردید ان الفاظ میں کی گئی تھی:

''اردو زبان کی ابتدا اور ارتقا کے سلسلے میں شیرانی صاحب..... کی تائید اور بعد میں آنے والے محققین کی تردید ان کے پوتے..... نے علمی اور منطقی انداز میں کر کے یہ ثابت کر دیا ہے کہ الولد سر لابیہ کا قول بالکل درست ہے۔''

ڈاکٹر صاحب کا ارادہ تھا کہ ''تحقیق'' کا ایک خصوصی شمارہ منسوبات کی تحقیق کے موضوع پر شائع کیا جائے۔ انہوں نے اس کے لئے مجھے بھی مضمون لکھنے کی دعوت دی اور اپنے ۱۲۲کتوبر ۱۹۹۴ء کے مکتوب کے ساتھ اس مجوزہ نمبر کا خاکہ بھی ارسال کیا۔

جون ۱۹۹۵ء میں میرے مقالے کی دوسری جلد اشاعت پذیر ہوئی تو میں نے حسب سابق ایک نسخہ ڈاکٹر صاحب کی خدمت میں روانہ کیا۔ ۲۴ نومبر ۱۹۹۵ ء کے خط سے اس کی رسید ملی، چناں چہ:

''بہت ممنون ہوں کہ آپ نے اپنی فاضلانہ کتاب 'حافظ محمود شیرانی اور ان کی علمی و ادبی خدمات' کی دوسری جلد بھی ارسال فرمائی جو مجھے یہاں تیسرے دن ۲۰ نومبر کو مل گئی تھی۔ تب سے مسلسل مطالعے میں ہے۔ آپ کی محنت و بصیرت قابل داد ہے۔ مبارک باد پیش کرتا ہوں آپ کو بھی اور آپ کے نگران، ہمارے مکرم ڈاکٹر وحید قریشی صاحب کو بھی، جن کی نگرانی میں یہ کام بحسن وخوبی تکمیل کو پہنچا تھا۔ غلط انتسابات کی تحقیق سے متعلق شیرانی مرحوم کے اصولوں اور طریقوں کو آپ نے کس عمدگی سے واضح کیا ہے۔''

بعد ازاں تحقیق منسوبات کے موضوع پر خصوصی شمارہ (دہم) کے لیے مقالے کے بارے میں یاد دہانی کرائی گئی ہے۔

مقالے کی دوسری جلد کے ساتھ ہی میں نے اپنے کالج کے مجلّے ''مرغزار'' کا ۱۹۹۵ء کا شمارہ بھی ان کے ملاحظے کے لیے ارسال کیا تھا۔ میری ملازمت سے سبک دوشی کی مناسبت سے اس میں میرا ایک انٹرویو بھی تھا۔ اس انٹرویو میں لاڑکانہ (سندھ) کا قیام ترک کرنے کے ضمن میں وہاں سے ڈومیسائل سرٹیفیکٹ کے حصول کی داستان شامل تھی جس کا آخری جملہ یہ تھا:

''بالآخر ڈومیسائل تو حاصل کر لیا لیکن دل میں ایک گرہ سی بیٹھ گئی کہ ایسی جگہ رہنے کا کوئی فائدہ نہیں جہاں کا معاشرہ تمہیں اپنا باشندہ بھی تسلیم نہ کرے۔''

اس قصے کا ڈاکٹر صاحب کے دل پر خصوصی اثر ہوا ہوگا جس کا اظہار انہوں نے اسی مکتوب کے بالائی حاشیے پر پس نوشت میں بدیں الفاظ کیا:

''سندھ میں جو کچھ گزری تھی، اس سے آگاہی ہوئی:

برلب گنگ و جمن بھی یوں تو گزرے حادثے
کیا کہیں ہم پر جو گزری برلب دریائے سندھ

یہ شعر پڑھ کر میرا دل ہل گیا، اس لیے کہ اس کے پس منظر میں ڈاکٹر صاحب کے ساتھ کیے گئے اس سلوک کی تلخ یادیں تھیں جو چند سال قبل سفہا کے ایک گروہ نے سندھ یونیورسٹی (جام شورو) میں ان کے ساتھ روا رکھا تھا۔ ہر چند بقول عتیق احمد جیلانی صاحب:

''خود ڈاکٹر صاحب نے اس معاملے پر کبھی لب کشائی نہ کی...... ان کے صبر و سکوت نے ہمارے دلوں میں ان کی عظمت کا نقش اور گہرا کر دیا۔''

(''ڈاکٹر نجم الاسلام'' (مضمون) ۔ مطبوعہ سہ ماہی ''انشا'' حیدر آباد، بابت جنوری، مارچ ۲۰۰۱ء)

لیکن روح کے گھاؤ بھی کبھی بھرا کرتے ہیں اور پھر ایسے حساس اور نفیس مزاج شخص کے دل پر لگے ہوئے چرکے؟ میں پورے وثوق سے کہہ سکتا ہوں کہ ڈاکٹر صاحب کے جملہ امراض میں سے بعض کے آغاز اور بعض میں شدت کا سبب یہی واقعہ فاجعہ تھا۔

ڈاکٹر صاحب کی سیرت کا ایک روشن پہلو یہ ہے کہ اپنی جسمانی اور ذہنی تکالیف اور علمی مشاغل میں انہماک کے باوجود وہ اپنے مخلصین کی صحت و عافیت کے لئے مشوش رہتے تھے۔ میں ۱۹۹۴ء میں علیل ہوا تو انہوں نے ایک خط میں لکھا:

''خدا آپ کو صحت کاملہ و عاجلہ عطا فرمائے۔ تہ دل سے آپ کی صحت یابی کی دعا کرتا ہوں۔ اپنا خیال رکھیے۔'' (نوشتہ ۲۲ اکتوبر ۱۹۹۴ء)

اگست ۱۹۹۶ء میں پنجاب میں سیلاب آیا تو اپنے یکم ستمبر کے خط کا آغاز ان الفاظ سے کیا:

''سیلاب کی خبروں میں شیخوپورہ کا نام بھی آتا رہا ہے۔ آپ کی خیریت کا طالب ہوں۔ ازراہ کرم مطلع فرمائیں۔''

اس مکتوب میں ایک بار پھر مقالے کی فرمائش کی ہے اور گوشہ تحقیق منسوبات کا خاکہ ملفوف کیا ہے۔ پس نوشت میں یہ اطلاع دی ہے کہ میرے مقالے کی دوسری جلد پر تبصرہ ان شاء اللہ شمارہ دہم میں شامل ہوگا۔

مجھے افسوس ہے کہ میں اپنی علالت اور دیگر مصروفیات کی بنا پر ''تحقیق'' کے شمارۂ خاص کے لئے، جو نمبرا:۔۱۰ کے تحت (۹۷۔۱۹۹۶ء) شائع ہوا، کوئی مضمون ارسال نہ کر سکا البتہ ان کا موعودہ تبصرہ اسی شمارے میں چھپا۔ اس میں حسب توقع انہوں نے میری خوب حوصلہ افزائی کی۔ اس کا اختتام ان الفاظ پر کیا گیا تھا:

''اس مقالہ علمی کی تحقیق و تصنیف پر اور اس کے تمام و کمال چھپ کر شائع ہو جانے پر نہ صرف فاضل مصنف کو بلکہ عمدہ پیش کش پر ناشر کو بھی مبارک باد پیش کی جاتی ہے۔''

ڈاکٹر صاحب میں عالمانہ انکسار بہت تھا۔ جب وہ اپنے خطوط پر پتا لکھتے ہوئے مجھ جیسے ہیچ مداں کے نام سے پہلے ''بخدمت فاضل گرامی'' کے الفاظ لکھتے تو بخدا گھڑوں پانی پڑ جاتا تھا۔

''مرغزار'' میں چھپنے والے میرے انٹرویو کے ساتھ تصویر بھی تھی۔ اس کے بارے میں

یوں اظہار خیال کرتے ہیں:

''نہایت شوق اور دل چسپی کے ساتھ آپ کا انٹرویو پڑھا اور تصویر دیکھی۔ اس طرح اس نادیدہ نیاز مند کو آدھی زیارت ہوگئی۔'' (نوشتہ ۲۴ نومبر ۱۹۹۵ء)

اس کے ساتھ ساتھ وہ مرحوم نیک محضر بھی تھے یعنی دوسروں کا احترام اور ان کے لیے نیک خواہشات کا اظہار صرف کسی کے منہ پر یا محض تحریر کی حد تک نہیں کرتے تھے بلکہ ''مودت اہل صفا چہ در ردی و چہ در قفا'' کے مصداق پیٹھ پیچھے بھی لوگوں کے بارے میں اچھے جذبات و خیالات ہی کا مظاہرہ ہوتا۔ عتیق احمد جیلانی صاحب کے محولہ بالا مضمون سے معلوم ہوا کہ ڈاکٹر صاحب اپنے شاگردوں اور ساتھیوں سے گفتگو میں جن لوگوں کا ذکر خیر کرتے، ان میں یہ عاجز بھی شامل تھا۔ جیلانی صاحب کے الفاظ یہ ہیں:

''پرانے اہل تحقیق میں سے حافظ محمود شیرانی کے خاص طور پر مداح تھے۔ حافظ صاحب کے پوتے ڈاکٹر مظہر محمود شیرانی کے علمی شغف کا ذکر بھی نہایت محبت سے کرتے۔''

میں نے جناب خورشید حسین بخاری (پرنسپل گورنمنٹ کالج، سانگلہ ہل) کے ایما پر، ان کے کالج کے رسالے ''لب جو'' میں خورشید احمد خان یوسفی مرحوم پر ایک مضمون دیا تھا۔ اس مضمون کا ایک جزوہ (آف پرنٹ) میں نے ڈاکٹر صاحب کو بھیجا۔ وہ ۲۵ اگست ۱۹۹۷ء کے مراسلے میں لکھتے ہیں:

''آف پرنٹ بعنوان 'خورشید احمد خاں یوسفی' بھی ملا جس سے معلوم ہوا کہ محترم خورشید احمد خاں صاحب وفات پا چکے ہیں۔ اللہ مغفرت فرمائے! بہت قلق ہوا۔ ان سے ایک ہی بار ملاقات ڈاکٹر وحید قریشی صاحب کے مکان پر ہوئی تھی۔ بڑی خوبیوں والے تھے۔''

میرے نام ڈاکٹر صاحب کا آخری مکتوب ۱۰ نومبر ۲۰۰۰ء کا نوشتہ ہے۔ غالباً اکتوبر کے آخر میں مجھے ''تحقیق'' کا شمارہ مشترکہ ۱۳۔۱۲ بابت ۹۹۔۱۹۹۸ء ملا تھا۔ ابھی میں اس کی رسید نہ دے پایا تھا کہ موصوف کا سامی نامہ پہنچ گیا جس میں مجلّے کی وصولی کے بارے میں استفسار کیا گیا تھا اور آخر میں میرے لیے وجہ شرمندگی بننے والا یہ جملہ:

''ملتمس ہوں کہ ہمارے فائدے کے لیے اپنے تاثرات سے بھی آگاہ فرمائیں۔ ہمیں رہنمائی ملے گی۔''

اب ذرا میری محرومی کا قصہ بھی سن لیجیے! مجھے ڈاکٹر صاحب سے ملنے کا اشتیاق تھا۔ ستمبر ۲۰۰۰ء کے پہلے ہفتے میں کراچی گیا۔ عزیزوں میں کوئی تقریب تھی۔ ۹ ستمبر میرے والد مرحوم کی تاریخ وفات ہے۔ اس مناسبت سے اختر شیرانی میموریل سوسائٹی، کراچی اور حیدر آباد کی بعض ادبی تنظیموں نے مل کر شاہ لطیف ہال، حیدر آباد میں یوم اختر شیرانی کا پروگرام بنایا۔ اس میں دو اجلاس تھے: پہلا مقالات کا، جس میں مجھے بھی اپنا مضمون پڑھنا تھا اور دوسرا مشاعرے کا۔ عشاء کے بعد کارروائی کا آغاز ہوا۔ ہال کھچا کھچ بھرا ہوا تھا۔ کراچی سے بھی خاصے لوگ آئے تھے۔ مجھے اپنے ایک عزیز کے ساتھ ان کے کسی قرابت دار کے ہاں ٹھہرنا تھا۔ رات کے تین بجے تقریب سے فارغ ہو کر جائے قیام پر پہنچے۔ اگلا دن اتوار کا تھا۔ میں اپنے میزبان سے کہہ چکا تھا کہ مجھے صبح اپنے کچھ مہربانوں سے ملنا ہے۔ دقت یہ تھی کہ اتوار کی شام کراچی میں ایک اہم مصروفیت تھی اور میرا وہاں پہنچنا ضروری تھا۔ بہر حال، صبح ناشتے سے فارغ ہو کر ہمارے میزبان اپنی گاڑی میں ہمیں محترم ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خان صاحب کی قیام گاہ پر لے گئے۔ ملاقات ہوئی تو دل خوش ہو گیا۔ وہ جس اپنائیت اور شفقت سے ملے، اس کی تفصیل کا یہ موقع نہیں۔ یہاں سے نکل کر ہم ٹنڈو یوسف کے قبرستان پہنچے۔ میں مولانا قاضی عمران خاں مرحوم کی تربت پر فاتحہ پڑھنا چاہتا تھا۔ کئی سال پہلے میں ان کے مرقد پر گیا تھا۔ پرانا نقشہ ذہن میں تھا لیکن اب تو جیسے گورستان کا حلیہ ہی بدل گیا ہو۔ کوئی ڈیڑھ گھنٹا صرف کیا اور اس اثنا میں اس وسیع شہر خموشاں کے مکینوں کے سیکڑوں کتبے پڑھ ڈالے لیکن مولانا کا مزار نہ مل سکا۔ آخر ایک طرف کھڑے ہو کر فاتحہ پڑھی اور لطیف آباد کا رخ کیا۔ پہلے نو (۹) نمبر میں والد مرحوم کے حقیقی عم زاد محترم احمد سعید خاں ساغر شیرانی کے ہاں حاضری دی۔ وہ علالت کے باعث گزشتہ رات کی تقریب میں نہ آ سکے تھے۔ ان کے پاس سے اٹھتے اٹھتے ظہر کا وقت ہو گیا۔ باہر نکل کر ڈاکٹر نجم الاسلام صاحب کا پتا دیکھنے کے لیے جیب میں ہاتھ ڈالا تو ڈائری غائب۔ مجھے تو مکان چھوڑ وارڈ

کا نمبر بھی یاد نہ تھا۔ اگر پہلے سے یہ گمان ہوتا تو رات کے جلسے میں بیسیوں لوگ ڈاکٹر صاحب کا پتا بتا سکتے تھے یا صبح بڑے ڈاکٹر صاحب سے پوچھ لیتے۔ غرض جی مسوس کر رہ گیا اور بے نیل مرام واپس ہوا۔ اے بسا آرزو کہ خاک شدہ۔

موئے پر سو درے کے مصداق اس محرومی پر یہ پریشانی مستزاد تھی کہ اگر ڈاکٹر صاحب کو میرے حیدر آباد آنے اور ان سے ملے بغیر چلے آنے کی کسی ذریعے سے اطلاع ملے گی تو وہ میرے اخلاقی معیار کے بارے میں کیا سوچیں گے۔ کوئی دو ماہ بعد جب ڈاکٹر صاحب کا ۱۰ نومبر والا خط مجھے ملا تو اس میں اس قسم کا کوئی تذکرہ نہ تھا۔ اس پر مجھے یک گونہ اطمینان ہوا لیکن کچھ کہا نہیں جا سکتا کہ واقعی مرحوم کو اس معاملے کی خبر نہ ہو سکی یا انہوں نے اپنی بردباری کے باعث اس کا ذکر کر کے مجھے شرمندہ کرنا مناسب نہ سمجھا۔ سوچا تھا کہ کبھی ملاقات کی صورت میں یہ قصہ خود ان کے گوش گزار کر دوں گا لیکن انہوں نے اس کی نوبت ہی نہ آنے دی اور اب تو:

بہ محشری تو اں گفت آنچہ در دل ماندہ است امشب

ان کا آخری نامہ گرامی مجھے ملنے کے ٹھیک تین ماہ بعد ۱۳ فروری ۲۰۰۱ء کو وہ اپنے مالک حقیقی کی بارگاہ میں حاضر ہو گئے۔ ہمارے اخبارات میں بالعموم صاحبان علم و فضل کے بارے میں خبروں، حتیٰ کہ ان کے سانحہ ارتحال پر بھی کوئی توجہ نہیں دی جاتی اور وہی صورت ہوتی ہے کہ:

ہوا صل پہ نقل جہاں فائق اور وہم حقیقت پر غالب
اس ملک ملمع پرور میں گم ہو زر خالص تو کیا غم

لیکن ڈاکٹر صاحب کی وفات کی خبر ۱۵ فروری ۲۰۰۱ء کے روزنامہ ''نوائے وقت'' (لاہور) میں مناسب تفصیل کے ساتھ شائع ہوئی۔ اس کا سبب یہ تھا کہ یہ الم ناک اطلاع کسی ذریعے سے پروفیسر ڈاکٹر سید معین الرحمٰن کو بروقت مل گئی اور انہوں نے نہ صرف لاہور کے علمی حلقوں کو اس سے مطلع کر دیا بلکہ اخبارات کو بھی فراہم کر دی۔ اسی لیے اس خبر میں مرحوم کے مختصر تعارف کے علاوہ لاہور کے متعدد صاحبان علم کے تاثرات بھی شامل تھے۔

خبر پڑھ کر سخت صدمہ ہوا لیکن بندگی بے چارگی۔ اللہ تعالیٰ ان پر ہزاروں رحمتیں نازل کرے۔ وہ بڑی خوبیوں سے متصف اور بے بدل انسان تھے۔ میں نے ان کی رحلت پر ایک قطعہ تاریخ وفات کہا تھا، اسی پر اپنی گزارشات ختم کرتا ہوں:

جب چلے خلد کو نجم الاسلام　　　ہو کے ابرار جہاں کے عاقب
جی میں آئی کہوں تاریخ وفات　　　اس ارادے سے ہوا جب راقب
قدسیوں نے یہ صدا دی ''باہم''　　　''بزم تحقیق کے نجم الثاقب''

۴۸　　　۱۹۷۴

+۴۸

۱۴۲۲ھ

حاشیہ:

(۱) ''تحقیق'' کا پہلا شمارہ مئی ۱۹۸۷ء میں شائع ہوا۔ یہ شعبہ اردو، سندھ یونیورسٹی، جام شورو، حیدرآباد کا شعبہ جاتی مجلہ ہے۔ پہلے شمارے کی مجلس مشاورت میں ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خاں، مسز رابعہ اقبال اور ڈاکٹر نجم الاسلام (مدیر) شامل تھے۔